تفہیم القرآن

(۳)

البقرہ

(از رکوع ۱۵ تا رکوع ۲۳)

اے[1] بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا، اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔ اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی، اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

---

[1] یہاں سے ایک دوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جسے سمجھنے کے لیے حسب ذیل امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

(۱) حضرت نوح کے بعد حضرت ابراہیم پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی، پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے، شرقِ اُردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحٰق کو، اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو مامور کیا، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکہ میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

(۲) حضرت ابراہیم کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسماعیل کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیل کی اولاد نہ تھے وہ بھی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۱) وہ بھی چونکہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے اس لیے اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے حضرت اسحاق کی اولاد جن میں حضرت یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، یحییٰ، عیسیٰ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، حضرت یعقوب کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انھوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے، مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی، اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

(۳) حضرت ابراہیم کا اصل کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دنیا میں اس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالک کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ ان کے بعد یہ امامت کا منصب ان کی نسل کی اُس شاخ کو ملا جو حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیاء پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی جسے اللہ تعالیٰ بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلا رہا ہے۔ اس شاخ کا مرکز بیت المقدس تھا اس لیے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی بیت المقدس ہی دعوت الی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔

(۴) پچھلے دس رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ان کی تاریخی فردِ قرارداد جرم اور ان کی وہ موجودہ حالت جو نزول قرآن کے وقت تھی بے کم و کاست پیش کر دی ہے اور ان کو یہ بتا دیا ہے کہ تم ہماری اس نعمت کی انتہائی ناقدری کر چکے ہو جو ہم نے تمھیں دی تھی، تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ منصبِ امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا بلکہ خود بھی حق اور راہِ حق سے پھر گئے، اور اب ایک نہایت قلیل عنصر صالح کے سوا تمھاری پوری امت میں کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔

(۵) اس جواب میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ امامت ابراہیم کے نطفہ کی میراث نہیں ہے بلکہ یہ اس سچی اطاعت و فرماں برداری کا پھل ہے جس میں ہمارے اس بندے نے اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا، اور اس کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیم کے طریقہ پر خود چلیں اور دنیا کو اس طریقہ پر چلانے کی خدمت انجام دیں۔ چونکہ تم اس طریقہ سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیت پوری طرح

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۵۴ پر)

تمہیں یاد ہے وہ واقعہ کہ ابراہیم کو اُس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تھا اور جب وہ اُن سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کھو چکے ہو، لہٰذا تمہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔

(۲) ساتھ ہی اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ اسرائیلی قومیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتی ہیں وہ ابراہیمی طریقے سے ہٹی ہوئی ہیں، نیز مشرکین عرب بھی جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے اپنے تعلق پر فخر کرتے ہیں محض نسل و نسب کے فخر لیے بیٹھے ہیں، ورنہ ابراہیم و اسماعیل کے طریقے سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ لہٰذا ان میں سے بھی کوئی امامت کا مستحق نہیں۔

(۳) پھر یہ بات ارشاد ہوتی ہے کہ اب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دوسری شاخ، بنی اسماعیل میں وہ رسول پیدا کیا ہے جس کے لیے ابراہیم اور اسماعیل نے دعا کی تھی۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور دوسرے تمام انبیاء کا تھا۔ وہ اور اس کے پیرو تمام ان پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں جو دنیا میں خدا کی طرف سے آئے ہیں، اور اسی راستے کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں جس کی طرف تمام انبیاء دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں۔

(۴) تبدیلِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر قبلہ کی تبدیلی کا اعلان بھی ضروری تھا۔ جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا، بیت المقدس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق رہا اور خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کیے گئے تو بیت المقدس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہو گئی۔ لہٰذا اعلان کر دیا گیا کہ اب مکہ مقام مرکزِ دین ہے، یہی کعبہ ہے جہاں سے اس رسول کی دعوت کا آغاز ہوا ہے۔ اور چونکہ ابتداء میں ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی تھا، اس لیے اہلِ کتاب اور مشرکین، کسی کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبہ ہی کو پہنچتا ہے۔ ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے کہ وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اعتراض کیے چلے جائیں۔

(۵) امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت اور کعبہ کی مرکزیت کا اعلان کرنے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے یہیں سے آخر سورہ تک بتدریج مسلسل اس امت کو وہ ہدایات دی ہیں جن پر اسے عمل پیرا ہونا چاہیے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) سورۂ قرآن میں مختلف مقامات پر ان تمام آزمائشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے جن سے گذر کر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

میں پورا اتر گیا تو اُس نے کہا "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"۔ ابراہیم نے عرض کیا "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟" اُس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے"۔[۱]

اور یہ کہ ہم نے اِس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اُس مقام کو مستقل جائے نماز بنا لو، اور ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اِس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک[۲] رکھو۔

اور یہ کہ ابراہیم نے دعا کی "اے میرے مالک! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے"۔ جواب میں اُس کے رب نے فرمایا "اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں[۳] گا مگر آخرکار اُسے عذابِ جہنم کی طرف گھسیٹوں گا، اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۳) حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ انھیں بنی نوع انسان کا امام و رہنما بنایا جائے۔ جس وقت سے حق اُن پر منکشف ہوا اس وقت سے لے کر مرتے دم تک اُن کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان محبت کرتا ہے، اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو، اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں جن سے آدمی ڈرتا ہے، اُن میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا جسے انھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی یہ وعدہ تمھاری اولاد کے صرف اُس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو۔ اُن میں سے جو ظالم ہوں گے اُن کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے۔

[۲] پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے، بلکہ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود، حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اُسے گندا کر دیا۔ یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکین قریش کے جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم ابراہیم و اسماعیل کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے اُلٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا اس سے جس طرح بنی اسرائیل مستثنیٰ ہو گئے ہیں اسی طرح یہ بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

[۳] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب منصبِ امامت کے متعلق پوچھا تھا تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا (باقی صفحہ ۱۵۵ پر)

اور یہ کہ ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اُٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے: "اے ہمارے مالک! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے آقا! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیعِ فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اُٹھائیو جو انھیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کی زندگیاں سنوارے[1]، تو بڑا مقتدر
اور حکیم ہے"۔ ع۱۵

اب وہ کون ہوگا جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو اس کے سوا اور کون یہ حرکت کر سکتا ہے! ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں خاص اپنی خدمت کے لیے چُن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اُس کے رب نے اُس سے کہا "مسلم[2] ہو جا" تو اُس نے فوراً کہا "میں مالکِ کائنات کا مسلم ہو گیا"۔ اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت اُس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب[3] اپنی اولاد کو کر گیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۴) وعدہ تمھاری اولاد کے صرف مومن و صالح لوگوں کے لیے ہے، ظالم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے انھوں نے جب رزق کے لیے دعا کی تو سابق فرمان کو پیشِ نظر رکھ کر صرف اپنی مومن اولاد ہی کے لیے دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں اس غلط فہمی کو فوراً رفع فرما دیا اور انھیں بتایا کہ امامتِ صالحہ اور چیز ہے اور رزقِ دنیا دوسری چیز۔ امامتِ صالحہ صرف مومنین صالحین کو ملے گی، مگر رزقِ دنیا مومن و کافر سب کو دیا جائے گا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل تزکیہ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

[2] مسلم۔ وہ جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے، جو خدا کو اپنا واحد مالک، آقا، حاکم اور معبود تسلیم کر لے، اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے، اور اُس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس عقیدے (باقی صفحہ ۱۵۶ پر)

اس نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا"
پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے
بیٹوں سے پوچھا "بچو! میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟" ان سب نے جواب دیا "ہم اسی ایک الٰہ[۱] کی
عبادت کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگ ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق نے الٰہ مانا ہے، اور ہم اسی کے
مسلم ہیں"۔

یہ لوگ گذر گئے، جو کچھ انھوں نے کمایا وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمھارے لیے ہے، تم
سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے[۲]۔

یہودی کہتے ہیں یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔
اے نبی! ان سے کہہ دو "ہم تو سب طریقوں کو چھوڑ کر ابراہیم کے طریقے کو لیتے ہیں، اور ابراہیم مشرکوں میں
سے نہ تھا[۳]"۔ مسلمانو! کہو کہ: "ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم،

(بقیہ صفحہ ۱۵۵) اور اس طرزِ عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہی تمام انبیاء کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آئے ہیں۔

[۱] حضرت یعقوب کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل براہِ راست انہی کی اولاد تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] الٰہ = معبود، مرکزِ پرستش، وہ جس سے دعائیں مانگی جائیں اور حاجتیں طلب کی جائیں، وہ جس کی پناہ ڈھونڈی جائے، وہ جسے نفع و نقصان کا مالک سمجھا جائے، وہ جو اپنے بالاتر اقتدار کی بنا پر اس کا مستحق ہو کہ انسان اس کی بندگی واطاعت کرے اور اس کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرے۔

[۲] یعنی اگرچہ تم اُن کی اولاد ہی مگر حقیقت میں تمھیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا نام لینے کا تم کو کیا حق ہے جبکہ تم ان کے طریقہ سے پھر گئے؟ اللہ کے ہاں تم سے اُن کے اعمال نہ پوچھے جائیں گے کہ پدرم سلطان بود کہہ کر چھوٹ جاؤ، بلکہ تم سے خود تمھارے اعمال پوچھے جائیں گے ـــــ اور یہ جو فرمایا کہ "جو کچھ انھوں نے کمایا وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمھارے لیے ہے"، تو یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں، قرآن اپنی زبان میں (باقی صفحہ ۵ اپر)

اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے،[۱۶۱] اور ہم اللہ

(حواشی صفحہ ۱۵۶) ۱۵۹ اسے کسب یا کمائی کہتا ہے۔ ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا برا نتیجہ رکھتا ہے جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے۔ اور چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیت اسی نتیجہ کی ہے اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے "کسب" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۶۰ اس جواب میں دو باتیں آگئیں۔ ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ "یہودیت" اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور "عیسائیت" جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعہ کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے پر ہی ہے تو حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ "یہودیت" اور "عیسائیت" نہ تھی، لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہے کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے، اور اُن کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرایا جائے، لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں جس پر حضرت ابراہیم چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) ۱۶۱ پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہ کیا جائے کہ فلاں حق پر تھا اور فلاں حق پر نہ تھا، یا یہ کہ ہم فلاں کو مانتے ہیں اور فلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے آئے ہیں، لہٰذا جو شخص صحیح معنی میں حق پرست ہو اُس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں (باقی صفحہ ۱۵۸ پر)

کے مسلم ہیں"۔

پھر اگر یہ لوگ اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے ہو تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے مُنہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں، لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلہ میں اللہ تمھاری حمایت کرے گا، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کہو "اللہ کا رنگ اختیار کرو[ؔ]۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا، اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں"۔

اے نبی! ان سے کہو: "کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی[ؔ]؟ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں، تمھارے اعمال تمھارے لیے، اور ہم تو بس اللہ ہی کے

(بقیہ صفحہ ۱۵۷) وہ حقیقت میں اُس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں جسے وہ مانتے ہیں، کیونکہ انھوں نے دراصل اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کو نہیں مانا ہے جسے حضرت موسیٰ یا عیسیٰ یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا، بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ اُن کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصب اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ؎ اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا"۔ دوسرے یہ کہ "اللہ کا رنگ اختیار کرو"۔ مسیحیت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص اُن کے مذہب میں داخل ہوتا اُسے غسل دیتے تھے اور اس غسل کے معنی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کی جس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اصطباغ (بپتسمہ) ہے، اور یہ اصطباغ نہ صرف اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اُن کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

؎ یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہم سب کا رب ہے اور اسی کی فرمانبرداری ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟

لیے اپنی بندگی کو خالص کر دینے والے لوگ ہیں۔[1] یا پھر کیا تمھارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب سب کے سب یہودی تھے، یا نصرانی تھے؟ کہو، تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟[2] اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمّہ اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائے؟[3] تمھاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے۔ — وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، اُن کی کمائی اُن کے لیے تھی اور تمھاری کمائی تمھارے لیے، تم سے اُن کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا! ع ۱۶

نادان لوگ ضرور کہیں گے: انھیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے[4] کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اُس سے

---

[1] یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی الوہیت و ربوبیت کی صفات میں شریک ٹھیرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو تو تمھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے، اس کا انجام خود دیکھ لوگے، مگر ہم نے تو اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دیا ہے۔

[2] یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے اُن جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر انبیاء سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

[3] یہ خطاب اُن کے علماء سے ہے جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود حق کو اپنے فرقوں ہی میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے، اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہاء، صوفیہ اور متکلمین نے وضع کیے انھی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علماء سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیاء علیہم السلام آخر تمھارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا علم انھیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقہ سے تھا، لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی تھے نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہوئی جاتی تھی۔

[4] قبلہ، وہ چیز جو آدمی کے منہ کے سامنے ہو اور جس کی طرف وہ متوجہ ہو۔ اصطلاح میں قبلہ سے مراد وہ جہت ہے جس کی

(باقی صفحہ ۱۶۰ پر)

یکایک پھر گئے؟ ؏ اے نبی ان سے کہو "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے ؏"۔ اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک "اُمتِ وَسَط" بنا دیا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو ؏

(بقیہ صفحہ سابق) طرف رُخ کر کے آدمی نماز پڑھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد سولہ یا سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؏ یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ ان لوگوں کے دماغ تنگ تھے، نظر محدود تھی، سمت اور مقام کے بندے بنے ہوئے تھے، ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی خاص سمت میں مقید ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کی تردید میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ اُسی طرف ہے، جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے وہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لیے عالمگیر حقیقتوں کے ادراک کی راہ کُھل جاتی ہے۔

؏ یہ اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ "اسی طرح" کا اشارہ دونوں طرف ہے، اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبہ پر پہنچے کہ "امتِ وَسَط" قرار دیے گئے۔ اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبہ کی طرف سمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کر کے اُمتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

"اُمتِ وَسَط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا بہترین گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو اور دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہوتا ہے اور ناحق ناروا تعلق کسی سے نہیں ہوتا۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں "اُمتِ وَسَط" اس لیے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو" تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اس وقت رسول ہمارے (باقی صفحہ آئندہ پر)

پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ معلوم کرنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہےؔ۔ سچ یہ ہے کہ یہ معاملہ بڑا سخت تھا مگر اُن لوگوں کے لیے

(حاشیہ صفحہ سابق) ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری نہ صرف پہنچا دی بلکہ عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول نے جو کچھ تمھیں پہنچایا تھا وہ تم نے انھیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمھیں دکھایا تھا وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے، اور اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اس اُمت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنا اسی طرح اس اُمت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں، اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت جو تیرے رسول کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی تھی تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے، یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا، ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، اُن سب کے لیے ائمۂ شر اور شیاطینِ انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے، اور ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے؟

سلہ یعنی یہ بات کھل جائے کہ جاہلیت کے تعصبات اور خاک و خون کی غلامی میں کون لوگ مبتلا ہیں اور کون ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہل عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے (باقی صفحہ آئندہ پر

آسان ہو گیا جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔ اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا، یقین جانو کہ وہ تم لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔

یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو، ہم اُسی قبلہ کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو[1]۔ مسجد حرام[2] کی طرف رُخ پھیر دو، اب جہاں کہیں تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو[3]۔

اور یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، یہ خوب جانتے ہیں کہ قبلہ بدلنے کا حکم اُن کے رب کی طرف سے

(بقیہ صفحہ سابق) اور عرب کے کعبہ کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی اس قوم پرستی کے بُت پر ناقابلِ برداشت ضرب تھا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلہ کے سوا کسی دوسرے قبلہ کو برداشت کرنا اُن کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بُت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں وہ اُس راستے پر کسی طرح نہ چل سکتے تھے جس کی طرف اللہ کا رسول انھیں بلا رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان بُت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے وہ قبلہ مقرر کیا تاکہ جو لوگ عربیت کے بُت کی پرستش کرتے ہیں وہ الگ ہو جائیں، پھر اُس قبلے کو چھوڑ کر یہ قبلہ بنایا تاکہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں وہ بھی الگ ہو جائیں، اور صرف وہ لوگ رسول کے ساتھ رہ جائیں جو کسی بُت کے پرستار نہیں، محض خدا کے پرستار ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دَور اور بیت المقدس کی مرکزیت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، اور اب کہ اسلام کی دعوت کا عَلَم بلند کرنے کے لیے آلِ یعقوب کے بجائے آلِ اسمٰعیل میں نبی مبعوث کیا گیا ہے تو اس دعوت کے لیے بیت المقدس کے بجائے کعبہ ہی موزوں مرکز ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ نہایت بے چینی کے ساتھ تحویل قبلہ کے حکم کا انتظار فرما رہے تھے۔ اسی معاملہ کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

[2] حرمت اور عزت والی مسجد۔ اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے جس کے وسط میں خانہ کعبہ واقع ہے۔

[3] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہو، اُسے بالکل ناک کی سیدھ میں کعبہ کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت ہر شخص کے لیے ہر جگہ مشکل ہے۔ اسی لیے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

بالکل بجا ہے، مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے لگیں۔ اور نہ تمہارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلہ کی پیروی کرو، کیونکہ ان میں سے کوئی گروہ دوسرے کے قبلہ کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے پھر اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔[1] جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس قبلہ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں[2]، مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے

(حاشیہ صفحہ سابق) نہ کہ کعبہ کی سیدھ میں۔ قرآن کی رو سے ہم اس بات کے لیے ضرور مکلف ہیں کہ حتی الامکان صحیح سمت کعبہ کی تحقیق کریں مگر اس بات پر مکلف نہیں ہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سمت معلوم کریں۔ جس سمت کے متعلق ہمیں امکانی تحقیق سے ظن غالب حاصل ہو جائے کہ یہ سمت کعبہ ہے، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے اور اگر کہیں آدمی کے لیے سمت قبلہ کی تحقیق مشکل ہو یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلہ کی طرف اپنی سمت قائم نہ رکھ سکتا ہو (مثلاً ریل یا کشتی میں)، تو جس طرف اسے قبلے کا گمان ہو یا جس طرف رُخ کرنا اُس کے لیے ممکن ہو اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر دوران نماز میں صحیح سمت قبلہ معلوم ہو جائے یا صحیح سمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہو جائے تو نماز کی حالت ہی میں اُس طرف پھر جانا چاہیے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] مطلب یہ ہے کہ قبلہ کے متعلق جو حجت و بحث یہ لوگ کرتے ہیں اس کا فیصلہ نہ تو اسی طرح ہو سکتا ہو کہ دلیل سے انہیں مطمئن کر دیا جائے، کیونکہ یہ تعصب اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں اور کسی دلیل سے بھی اُس قبلہ کو چھوڑ نہیں سکتے جسے یہ اپنے گروہ بندی کے تعصبات کی بنا پر پکڑے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ان کے قبلہ کو اختیار کر لو، کیونکہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں اور اُسے اختیار کر لینے سے قبلہ کا جھگڑا چُک جائے۔ مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں، ایک کا قبلہ اختیار کر کے بس ایک ہی گروہ کو راضی کر سکو گے، دوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمہارا یہ کام ہی نہیں ہے کہ تم لوگوں کو راضی کرتے پھرو اور ان سے لین دین کے اصول پر مصالحت کیا کرو، بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ جو علم ہم نے تمہیں دیا ہے سب سے بے پروا ہو کر صرف اسی پر سختی کے ساتھ قائم ہو جاؤ۔ اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کرو گے تو اپنے پیغمبری کے منصب پر ظلم کرو گے اور اُس نعمت کی ناشکری کرو گے جو دنیا کا امام بنا کر ہم نے تمہیں بخشی ہے۔

[2] یہ عرب کا محاورہ ہے جس چیز کو آدمی یقینی طور پر جانتا ہو وہ اُس کے متعلق کسی قسم کا شک و اشتباہ (باقی صفحہ ۱۶۴ پر)

ع ۱۷ رب کی طرف سے ہے لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔
ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے جس کی طرف وہ مُڑتا ہے، تم بھلائیوں کا رُخ لو اور انہی میں سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ جہاں بھی تم ہوگے اللہ تمہیں پالے گا، اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں تمہارا گذر جس مقام سے بھی ہو وہیں سے اپنا رُخ نماز کے وقت مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمہارا گذر ہو اپنا رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف پھیرو اور جہاں بھی تم ہو اُسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے[سلہ] ـــ ہاں جو ظالم ہیں اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی، تو اُن سے تم نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو ـــ اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں[۱۵۵] اور اِس توقع پر[سلہ] کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤگے جس طرح میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول

(بقیہ صفحہ ۱۶۱) نہ رکھتا ہو اُسے یوں کہتے ہیں کہ وہ اس چیز کو ایسا پہچانتا ہے جیسا اپنی اولاد کو پہچانتا ہے یعنی جس طرح اسے اپنے بچوں کو پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اسی طرح وہ بلا کسی شک کے یقینی طور پر یہ بات جانتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء حقیقت میں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بیت المقدس سے صدیوں پہلے جو گھر اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا تھا اور جسے حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں قبلۂ اہلِ حق بنایا گیا تھا وہ یہی کعبہ تھا۔ اس تاریخی واقعہ میں اُن کے لیے ذرہ برابر کسی اشتباہ کی گنجائش نہ تھی۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی ہمارے اِس حکم کی پوری پابندی کرو، کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سمت کے سوا کسی دوسری سمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے تاکہ کسی کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع نہ ملے کہ کیا خوب امتِ وسط ہے، کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں جو یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔

۱۵۵ نعمت سے مراد وہی امامت و پیشوائی کی نعمت ہے جو بنی اسرائیل سے سلب کرکے اس امت کو دی گئی۔ دنیا میں ایک امت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے امرِ شرعی سے اقوامِ عالم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سپرد کی جائے۔ یہ منصب جس امت کو دیا گیا حقیقت میں اُس پر اللہ کے فضل و انعام کی تکمیل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمہاری (باقی صفحہ ۱۶۵ پر)

بھیجا اور وہ تمھیں میری آیات سناتا ہے، تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔ ع ۱۸

اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمھیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اور ہم ضرور ہی تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمھاری آزمائش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے، انھیں خوشخبری دیدو، اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی اور اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی، اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں [۱]۔

یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرلے [۲]، اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا

(بقیہ صفحہ ۱۶۴) سرفرازی کا نشان ہے، لہٰذا تمھیں اس لیے بھی اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کروگے تو یہ نعمت تم پر مکمل کردی جائے گی۔

[۲] یعنی اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے یہ امید رکھو — یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے، بادشاہ کا اپنی شانِ بے نیازی کے ساتھ کسی نوکر سے یہ کہہ دینا کہ فلاں عنایت و مہربانی کی اُمید رکھو، اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر خوشی کے شادیانے بجوادے اور اُسے مبارک بادیاں دی جانے لگیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] منصبِ امامت پر مامور کرنے کے بعد اب اس امّت کو ضروری ہدایات دی جارہی ہیں، مگر تمام دوسری باتوں سے پہلے انہیں جس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے جس پر تم لٹائے جارہے ہو بلکہ اس عظیم الشان خدمت کا بار اٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤگے، طرح طرح کے نقصان اُٹھانے پڑیں گے، اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا (باقی صفحہ ۱۶۲)

کام کرے گا[1] اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں دراں حالے کہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو ان پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں[2]۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں اُن کو میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

(بقیہ صفحہ ۱۶۵) مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں بڑھے چلے جاؤ گے تب تم پر عنایات کی بارش ہو گی۔

[1] صفا اور مروہ مسجدِ حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان دوڑنا منجملہ ان مناسک کے تھا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے حضرت ابراہیم کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکہ اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مشرکانہ جاہلیت پھیل گئی تو صفا پر "اساف" اور مروہ پر "نائلہ" کے استھان بنا لیے گئے اور اُن کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسلام کی روشنی اہلِ عرب تک پہنچی تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صفا اور مروہ کی سعی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانۂ شرک کی ایجاد ہے؟ اور یہ کہ اس سعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے؟ لہٰذا کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کے بعد ضروری احکام و ہدایات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسی غلط فہمی کو دور فرمایا اور مسلمانوں کو بتایا کہ یہ فعل حج کے اُن مناسک میں سے ہے جو اللہ نے مقرر فرمائے تھے اور اس فعل کے کرنے سے تمہیں ہرگز یہ خوف نہ کرنا چاہیے کہ کسی گناہ کے مرتکب ہو گے۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [1] یعنی بہتر تو یہ ہے کہ یہ کام دلی رغبت کے ساتھ کرو، ورنہ حکم بجا لانے کے لیے تو کرنا ہی ہو گا۔

[2] علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کا علم پھیلانے کے بجائے ربیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے تک سے مقید رکھا اور عامۂ خلائق تو درکنار خود یہودی عوام تک کو علمِ کتاب کی ہوا نہ لگنے دی۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے گمراہیاں پھیلیں تو ان کے علما نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ان ضلالتوں کو اپنے قول و عمل یا اپنے سکوت سے الٹی سند جواز عطا کرنے لگے۔ اسی سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جا رہی ہے۔ دنیا کی ہدایت کا کام جس امت کے سپرد کیا جائے اس کا فرض یہ ہے کہ اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے نہ کہ بخیل کے مال کی طرح چھپا کر رکھے۔

جن لوگوں نے کفر کا رویہ[۱] اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔

ع۱۵ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، اُس رحمان اور رحیم کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔ (اس حقیقت کو پہچاننے کیلئے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اُس کے ذریعہ سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں۔

[۱] "کفر" کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلہ میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنی ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کرنا۔ اس کے برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کردینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ ہی کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا الٰہ اور رب ماننے سے انکار کردے، یا اُسے واحد الٰہ اور رب نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کردے۔

تیسرے یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ اسے اللہ کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انھیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے، اور اپنی پسند یا اپنے تعصبات کی بنا پر اُن میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں اُن کو

(باقی صفحہ ۱۶۸ پر)

سب بے شمار نشانیاں ہیں[۱] ۔ مگر (وحدت اللہ پر دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں[۲] اور ان کے

(بقیہ صفحہ ۱۶۷) یا ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے،

چھٹے یہ کہ نظری طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا ہے۔

یہ سب مختلف رویے اللہ کے مقابلہ میں بغاوت کے رویے ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویہ کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اور بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کفران نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جو شکر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسانمند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلہ میں کفر یا کفران نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے اور ضد یا تعصب سے آزاد ہو کر سوچے تو یہ آثار جو اس کے مشاہدے میں آ رہے ہیں اُسے اس نتیجہ پر پہنچانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادر مطلق حکیم کے زیر فرمان ہے، تمام اختیار و اقتدار بالکل اسی ایک کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کی خود مختارانہ مداخلت یا شراکت کے لیے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا فی الحقیقت وہی ایک خدا تمام موجودات عالم کا الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں کہ الوہیت میں اس کا کوئی حصہ ہو۔

[۲] یعنی جو صفات اللہ کے لیے خاص ہیں اُن میں سے بعض کو اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور جو حقوق اللہ کے ہیں اُن میں سے بعض یا تمام حقوق اُن کو دیتے ہیں، مثلاً سلسلۂ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریاد رسی،

(باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے ۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں[1] ۔ کاش جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں، اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے ۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، مگر سزا پاکر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا، اور وہ لوگ جو دنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری

(بقیہ صفحہ ۱۶۸) دعائیں سننا اور غیب و شہادت ہر چیز سے واقف ہونا یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں، اُسی کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جھکائیں، اُسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رجوع کریں، اُسی کو مدد کے لیے پکاریں، اسی پر بھروسہ کریں، اُسی سے امیدیں وابستہ کریں اور اُسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ اسی طرح مالک الملک ہونے کی حیثیت سے یہ بات بھی اللہ ہی کے لیے خاص ہے کہ اپنی رعیت کے لیے حرام و حلال کے حدود مقرر کرے، ان کے فرائض اور حقوق معین کرے، ان کو امر و نہی کے احکام دے، اور انہیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح کن کاموں میں کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں، اس کو منبعِ قانون مانیں، اس کو امر و نہی کا مختار سمجھیں، اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے حکم کو فیصلہ کُن قرار دیں، اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ جو شخص ان صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اور ان حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دوسرے کو دیتا ہے وہ دراصل اسے اللہ کا مدِ مقابل اور اس کا ہمسر بناتا ہے۔ اور اسی طرح جو شخص یا جو ادارہ ان صفات میں سے کسی صفت کا مدعی ہے اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے وہ دراصل خدا کا مدِ مقابل اور ہمسر بنتا ہے خواہ زبان سے اس کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یعنی ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ آدمی کے لیے اللہ کی رضا ہر دوسرے کی رضا پر مقدم ہو (باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

ظاہر کر رہے ہیں ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔[له] یوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں ان کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔ ع ۲۰

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انھیں کھاؤ[له] اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو وہ تو تمھارا کھلا دشمن ہے تمھیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔[له]

اِن سے جب کہو کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔[له] اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے سے انکار کر دیا ہے اِن کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا

(بقیہ صفحہ ۱۶۹) اور کسی چیز کی محبت بھی انسان کے دل میں یہ مرتبہ اور مقام حاصل نہ کرے کہ وہ اللہ کی محبت پر اُسے قربان کر سکتا ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) له یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور اُن کے نادان پیروؤں کے انجام کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مبتلا ہو کر پچھلی امتیں بھٹک گئیں اس سے مسلمان ہشیار رہیں اور رہبروں میں تمیاز کرنا سیکھیں اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں۔

له یعنی کھانے اور پینے کے معاملہ میں جتنی پابندیاں توہمات اور جاہلانہ رسوم کی بنا پر لگ گئی ہیں اُن سب کو توڑ ڈالو۔

له یعنی اِن اوہام و رسوم اور حدود و قیود کے متعلق یہ کہنا کہ یہ سب مذہبی امور ہیں جو خدا کی طرف سے تعلیم کیے گئے ہیں، حالانکہ تمھارے پاس کوئی مستند ذریعہ یہ معلوم کرنے کا نہیں ہے کہ وہ واقعی خدا کی طرف سے ہیں، دراصل شیطانی اغوا کا کرشمہ ہے۔

له یعنی ان پابندیوں کے لیے اُن کے پاس کوئی سند اور کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہے کہ باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے، اور وہ احمق یہ سمجھتے ہیں کہ کسی طریقہ کی پیروی کے لیے یہ حجت بالکل کافی ہے۔

جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے[۱۷۱]۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، ذرا عقل سے کام نہیں لیتے۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو[۱۷۲]۔ اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے[۱۷۳] کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے

---

۱۷۱ اس تمثیل کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں کی حالت اُن بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلّے اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سمجھے بوجھے اُن کی صداؤں پر حرکت کرتے ہیں۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جانوروں کو پکارا جا رہا ہے جو فقط آواز سنتے ہیں مگر کچھ نہیں سمجھتے کہ کہنے والا اُن سے کیا کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال فرمائے ہیں کہ یہ دونوں پہلو اُن کے تحت آجاتے ہیں۔

۱۷۲ یعنی اگر تم اللہ ہی کے فرمان کے پابند ہو چکے ہو تو پھر جاہلیت کے زمانہ کی تمام وہ پابندیاں جو پنڈتوں اور پروہتوں نے، ربیّوں اور پادریوں نے، جوگیوں اور راہبوں نے اور تمھارے باپ دادا نے قائم کی تھیں انھیں توڑ ڈالو اور جن جن چیزوں کو اللہ نے حلال کیا ہے انھیں بغیر کسی کراہت اور رکاوٹ کے کھاؤ پیو۔ اسی مضمون کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذالک المسلم الخ یعنی جس نے وہی نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں اور اسی قبلہ کی طرف رخ کیا جس کی طرف ہم کرتے ہیں اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے اور قبلہ کی طرف رُخ کرنے کے باوجود ایک شخص اس وقت تک اسلام میں پوری طرح جذب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں پچھلی جاہلیت کی پابندیوں کو توڑ نہ دے اور اُن توہمات کی بندشوں سے آزاد نہ ہو جائے جو اہل جاہلیت نے قائم کر رکھی تھیں کیونکہ اُس کا اُن پابندیوں پر قائم رہنا اس بات کی علامت ہے کہ ابھی تک اس کی رگ و پے میں جاہلیت کا زہر موجود ہے۔

۱۷۳ اس آیت کا مقصد اُن حرام چیزوں کی فہرست بیان کرنا نہیں ہے جو شریعت الٰہی میں ممنوع ٹھیرائی گئی ہیں، بلکہ جاہلیت کے توہمات کی تردید مقصود ہے۔ یعنی اُن سے یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ تم نے اپنے مذہبی توہمات کی رو سے جن چیزوں کو ممنوع ٹھیرا رکھا ہے وہ دراصل ممنوع نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں۔

سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو[۱۷۰]۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے[۱۷۱]، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

حق یہ ہے کہ جو لوگ اُن احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدوں پر انھیں بھینٹ چڑھاتے ہیں، وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں[۱۷۲]۔ قیامت کے روز اللہ ہرگز اُن سے بات نہ کرے گا اور نہ انھیں پاکیزہ ٹھیرائے گا[۱۷۳]، بلکہ اُن کے لیے تو دردناک سزا

۱۷۰؎ اس کا اطلاق اس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور اُس کھانے پر بھی ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر بطور نذر کے پکایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور ہو یا غلہ یا اور کوئی کھانے کی چیز اُس کا مالک دراصل اللہ ہے اور اللہ ہی نے وہ ہم کو عطا کیا ہے، لہٰذا اعترافِ نعمت یا صدقہ یا نذر و نیاز کے طور پر اگر کسی کا نام ان چیزوں پر لیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہی کا نام ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کا نام لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم خدا کے بجائے یا خدا کے ساتھ اس کی بالاتری بھی تسلیم کر رہے ہیں اور اسکو بھی منعم سمجھتے ہیں۔

۱۷۱؎ اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت ہو۔ مثلاً بھوک یا پیاس سے جان پر بن گئی ہو، یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اور اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے، مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہو۔

۱۷۲؎ مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں میں یہ جتنے غلط توہمات پھیلے ہیں اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی نئی شریعتیں بن گئی ہیں ان سب کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جن کے پاس کتابِ الٰہی کا علم تھا مگر انھوں نے عامۂ خلائق تک اس علم کو نہ پہنچایا اور جب لوگوں میں غلط طریقے رواج پانے لگے تو اس وقت بھی وہ ظالم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے، بلکہ ان میں سے بہتوں نے خود اپنا فائدہ اس میں دیکھا کہ کتاب اللہ کے احکام پر (باقی صفحہ ۱۷۳ پر)

مقرر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لے لیا۔ کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں! یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔

۲۱ع

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف[سلہ]، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور یوم آخر اور ملائکہ اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنے دل پسند مال کو رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کا وقت آئے یا حق و باطل کی جنگ ہو تو اس میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۷۲) پر دہ ہی پڑا رہے۔

سٹلہ یہ دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعووں کی تردید اور اُن غلط فہمیوں کا رد ہے جو انھوں نے عام لوگوں میں اپنے متعلق پھیلا رکھی ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگ بھی اُن کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے ہیں کہ اُن کی ہستیاں بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس ہیں اور جو اُن کا دامن گرفتہ ہو جائیگا اُس کی سفارش کر کے وہ اللہ کے ہاں اسے بخشوا لیں گے۔ جواب میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم انھیں ہرگز منہ نہ لگائیں گے اور نہ انھیں پاکیزہ قرار دیں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو تو محض بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے، ورنہ دراصل مراد یہ ہے کہ مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کر دینا اور صرف ضابطہ کی خانہ پُری کے طور پر چند مقرر مذہبی اعمال انجام دے دینا، اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کر دینا وہ حقیقی نیکی نہیں ہے جو اللہ کے ہاں وزن اور قدر رکھتی ہے۔

اے ایمان لانے والو! تمھارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص[1] کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے[2]۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اُس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو[3] تو معروف[4] طریقہ کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور

---

[1] قصاص = بدلہ۔ یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے جو اُس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقہ سے مقتول کو قتل کیا ہو اُسی طریقہ سے اس کو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اُس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے وہی اُس کے ساتھ کیا جائے۔

[2] جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلہ کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو، محض مقتول کے بدلہ میں قاتل کی جان لے لینے سے اُن کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے ادنیٰ درجہ کے آدمی نے مار دیا ہو تو وہ اس قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ اس گروہ کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے یا اُس کے کئی آدمی اُن کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول اُن کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجہ کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلہ میں قاتل کی جان لی جائے۔ اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی۔ موجودہ زمانہ میں جن قوموں کو انتہائی مہذب سمجھا جاتا ہے اُن کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔ اکثر یہ خبریں ہمارے کان سنتے ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اُڑائے گئے۔ اور ایک "مہذب" قوم نے تو اپنے ایک فرد (سرلی اسٹیک) کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔ دوسری طرف ان نام نہاد مہذب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ حاکم قوم کا فرد اگر قاتل اور محکوم قوم کا فرد مقتول ہو تو وہ قصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ یہی خرابیاں ہیں جن کے سدباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے۔ وہ

(باقی صفحہ ۱۷۵ پر)

قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خونبہا ادا کرے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، اس پر بھی جو زیادتی کرے[1] اس کے لیے دردناک سزا ہے ـــ عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے[2]، امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

(بقیہ صفحہ سابق) فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے قطع نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون۔

تلہ "بھائی" کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقہ سے نرمی کی سفارش بھی کر دی۔ اگرچہ تمھارے اور دوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بَیر ہی سہی، مگر ہے تو وہ تمھارا انسانی بھائی، لہٰذا اگر اپنے ایک خطا کار بھائی کے مقابلہ میں انتقام کے غصے کو پی جاؤ تو یہ تمھاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے ـــ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف کر دیں، اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خونبہا ادا کرنا ہو گا۔

سکہ "معروف" کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد وہ صحیح طریق کار ہے جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں اور جس کے متعلق ہر اس شخص کا دل جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو یہ گواہی دیتا ہے کہ یہی حق اور انصاف ہے اور یہی مناسب طریق عمل ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی مقتول کا وارث خونبہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خونبہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

ملہ یہ ایک دوسری جاہلیت کی تردید ہے جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے جس طرح اہلِ جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا اسی طرح ایک دوسرا گروہ عفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اُس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس سزا کو نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دنیا کے متعدد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہلِ عقل کو مخاطب کر کے تنبیہ کرتا ہے کہ قصاص میں سوسائیٹی کی زندگی ہے، جو سوسائیٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو محترم ٹھیراتی ہے وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقہ سے وصیت کرے، یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔[۱۸۲] پھر جنھوں نے وصیت سنی اور بعد میں اُسے بدل ڈالا تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہو گا، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، اور پھر معاملہ سے تعلق رکھنے والوں
ع۲۲ کے درمیان وہ اصلاح کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اے ایمان لانے والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں[۱۸۳] جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔ چند مقرر دنوں کے روزے فرض

---

[۱۸۲] یعنی جن لوگوں کی خبر گیری، مدد اور خدمت وہ اپنی زندگی میں کرتا تھا، اگر وہ اپنے پیچھے اتنے وسائل چھوڑے جا رہا ہے کہ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہو تو اس کو چاہیے کہ ان کے حق میں وصیت کر جائے اور اپنے وارثوں کو ہدایت کر دے کہ فلاں فلاں مستحقین کے ساتھ یہ حسن سلوک کیا جائے۔ مگر یہ وصیت "معروف" طریقہ سے ہونی چاہیے، یعنی ایسے طریقہ سے جس میں کسی کے ساتھ بے انصافی اور کسی کی حق تلفی نہ ہو، جسے دیکھ کر ہر بے غرض معقول انسان کہہ دے کہ یہ ایک مناسب وصیت ہے۔ جب تک وراثت کے احکام نازل نہ ہوئے تھے اس وقت تک اپنے پسماندوں میں وراثت کی تقسیم کے متعلق وصیت کرنا بھی مرنے والے ہی کا کام تھا۔ مگر جب وارثوں کے حقوق اللہ نے خود مقرر فرما دیے تو کسی شخص کو یہ حق باقی نہ رہا کہ وہ وارثوں کے درمیان حصوں کی تقسیم کے بارے میں کوئی وصیت کر سکے۔ البتہ وہ اپنے والدین یا دوسرے عزیزوں کے لیے حسن سلوک کی عام وصیت کر سکتا ہے، یا کسی رفاہِ عام کے کام میں کچھ صرف کرنے کی ہدایت کر سکتا ہے۔ حدیثِ نبوی کی رو سے یہ وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حصہ میں نافذ ہو گی۔ اس سے زیادہ کی وصیت نافذ نہیں ہو گی۔

[۱۸۳] اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر رمضان کے روزوں کا حکم قرآن میں نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ البتہ صرف

(باقی صفحہ ۱۷۷ پر)

ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے۔ جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں پھر نہ رکھیں تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے[۱] تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔[۲]

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن جیسی کتاب نازل کی گئی جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینہ کو پائے اُس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینہ کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو[۳] تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکرگذار بنو۔[۴]

(بقیہ صفحہ ۱۷۶) مریض، مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اسے بدستور باقی رہنے دیا گیا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ایک سے زیادہ آدمیوں کو کھانا کھلائے۔ یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔

[۲] یہاں تک وہ ابتدائی حکم ہے، جو رمضان کے روزوں کے متعلق پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیات ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مناسبت مضمون کی وجہ سے اسی سلسلہ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

[۳] سفر کی حالت میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا آدمی کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہ سفر میں جایا کرتے تھے اُن میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا، اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرت نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (باقی ۱۷۸ پر)

اور اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں، لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں[1] یہ بات تم انھیں سنا دو، شاید کہ وہ راہِ راست پالیں[2]

تمہارے لیے روزے کے دنوں میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے[3]۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، مگر اُس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا[4]۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۷) یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا روزے سے ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا یہ نیکی نہیں ہے۔

عہ یعنی اللہ نے صرف رمضان ہی کے دنوں کو روزوں کے لیے مخصوص نہیں کر دیا، بلکہ جو رمضان میں روزے نہ رکھ سکیں اُن کے لیے دوسرے دنوں میں اُس کی قضا کر لینے کا راستہ بھی کھول دیا ہے تاکہ قرآن کی جو نعمت اس نے تم کو دی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے قیمتی موقع سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یعنی اگر تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے محسوس کر سکتے ہو تو یہ خیال مت کرو کہ میں تم سے دور ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے میں اُسے بھی سُن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے الٰہ اور رب قرار دے رکھا ہے اُن کے پاس تو تمہیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمہاری شنوائی کر سکتے ہیں اور نہ اُن میں یہ طاقت ہے کہ تمہاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ مگر میں کائناتِ بے پایاں کا فرمانروائے مطلق، تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطہ اور وسیلہ اور سفارش کے براہِ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک ایک بے اختیار بناوٹی خدا کے در پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میں جو دعوت تمہیں دے رہا ہوں اس پر لبیک کہہ کر میرا دامن پکڑ لو، میری طرف رجوع کرو، مجھ پر بھروسہ کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آ جاؤ۔

[2] یعنی تمہارے ذریعے سے یہ حقیقت حال معلوم کر کے اُن کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ اس صحیح رویّہ (باقی صفحہ ۹۰ پر)

شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لیے جائز کر دیا ہے اُسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے[۱]۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک[۲] اپنا روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں معتکف[۳] ہو تو بیویوں سے مباشرت

(بقیہ صفحہ ۱۷۸) کی طرف آجائیں جس میں خود انہی کی بھلائی ہے۔

سلہ یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا بلکہ دونوں کا باہمی تعلق و اتصال بالکل غیر منفک ہوتا ہے اسی طرح تمہارا اور تمہاری بیویوں کا تعلق بھی ہے۔

سلہ ابتدا میں اگرچہ کوئی ایسا صاف حکم نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں مسلمان اپنی بیویوں سے تعلق زن و شو نہ رکھیں، لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور پھر اس کے ناجائز یا مکروہ ہونے کا خیال دل میں لیے ہوئے بیویوں کے پاس جاتے تھے۔ یہ گویا اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک مجرمانہ اور گناہگارانہ ذہنیت انکے اندر پرورش پاتی رہے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اس خیانت پر تنبیہ فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمہارے لیے جائز ہے لہٰذا اب اسے برا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قلب و ضمیر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اسلام نے اپنی عبادات کے لیے اوقات کا وہ معیار مقرر کیا ہے جس سے دنیا میں ہر وقت ہر تمدن کے لوگ ہر جگہ اوقات کا تعین کر سکتے ہیں۔ وہ گھڑیوں کے لحاظ سے وقت مقرر کرنے کے بجائے اُن آثار کے لحاظ سے وقت مقرر کرتا ہے جو آفاق میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ناواقف لوگ عموماً ان اوقات کے متعلق یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قطبین کے قریب جہاں رات اور دن کئی کئی مہینے کے ہوتے ہیں وہاں اوقات کی یہ تعیین کیسے چل سکے گی؟ لیکن یہ اعتراض در اصل علم جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں نہ وہاں چھ مہینوں کی رات اُس معنی میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن، جس معنی میں ہم خط استوا کے آس پاس رہنے والے لوگ دن اور رات کے لفظ بولتے ہیں۔ خواہ رات کا دور ہو یا دن کا صبح و شام کے آثار بہر حال وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ اُفق پر نمایاں ہوتے ہیں اور انہی کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے جاگنے اور کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا تب بھی فن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ

(باقی صفحہ ۱۸۸ پر)

نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا۔[۱] اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں

(بقیہ صفحہ ۱۷۸) ہی افق کے آثار تھے۔ لہٰذا جس طرح دوسرے تمام معاملات میں یہ آثار اُن کے لیے تعیینِ اوقات کا کام دیتے ہیں اسی طرح نماز اور سحر و افطار کے معاملہ میں بھی دے سکتے ہیں۔

۲؎ رات تک روزہ پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں رات کی سرحد شروع ہوتی ہے وہیں تمہارے روزے کی سرحد ختم ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ رات کی سرحد غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے لہٰذا غروبِ آفتاب ہی کے ساتھ افطار کر لینا چاہیے۔ سحر اور افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصہ میں افق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نظر آنے لگے تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اور جب دن کے آخری حصہ میں مشرق کی جانب رات کی سیاہی بلند ہوتی نظر آئے تو افطار کا وقت آ جاتا ہے۔

۳؎ معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رمضان کے آخری دس دن مسجد میں گذارے اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لیے مختص کر دے۔ اس اعتکاف کی حالت میں آدمی اپنی ضروری کاموں کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے مگر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو شہوانی لذتوں سے روکے رکھے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱؎ یہ نہیں فرمایا کہ اِن حدود سے تجاوز نہ کرنا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سرحد جہاں سے معصیت شروع ہوتی ہے، اُس کے آخری کناروں ہی پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ آدمی سرحد سے دور ہی رہے تاکہ بھولے سے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اُس حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لکل ملک حمی وان حمی اللہ محارمہ فمن رتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ۔ عربی زبان میں حِمیٰ اُس چراگاہ کو کہتے ہیں جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کر دیتا ہے۔ اس محاورے کو استعمال کرتے ہوئے حضور فرماتے ہیں کہ "ہر بادشاہ کی ایک حمی ہوتی ہے، اور اللہ کی حمی اُس کی وہ حدیں ہیں جن سے اس نے حرام و حلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے۔ تو جو جانور اس حمی کے گرد ہی چرتا رہے گا ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ حمی کے اندر داخل ہو جائے"۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ جو شریعت کی روح سے ناواقف ہیں ہمیشہ اجازت کی آخری حدود تک ہی جانے پر اصرار کرتے ہیں اور بہت سے علماء و مشائخ بھی اسی غرض کے لیے سندیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جواز کی آخری حدیں انھیں بتایا کرتے ہیں (باقی صفحہ ۱۸۱ پر)

کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے تاکہ وہ غلط رویہ سے بچیں۔
اور تم نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقہ سے کھاؤ، اور نہ حاکموں کے آگے اُن کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقہ سے کھانے کا موقع مل جائے۔ ع ۲۳

(بقیہ صفحہ ۱۸۰) تاکہ وہ اُس باریک خطِ امتیاز ہی پر گھومتے رہیں جہاں طاعت اور معصیت کے درمیان محض بال برابر فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بکثرت لوگ معصیت اور معصیت سے بھی بڑھ کر ضلالت میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ ان باریک سرحدی خطوط کی تمیز اور اُن کے کنارے پہنچ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) ؎ اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدے اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تم یہ جانتے ہو کہ یہ مال دوسرے کا ہے تو محض اس لیے کہ اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے یا کسی اینچ پینچ سے اس کو تم کھا سکتے ہو، اُس کا مقدمہ عدالت میں نہ پیش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ حاکمِ عدالت روداد مقدمہ کے لحاظ سے وہ مال تم کو دلوا دے مگر حاکم کا یہ فیصلہ اصل میں غلط بنائی ہوئی روداد سے دھوکا کھا جانے کا نتیجہ ہوگا اس لیے باقاعدہ شرعی عدالت سے اس کی ملکیت کا حق حاصل کر لینے کے باوجود حقیقت میں تم اس کے جائز مالک نہ بن جاؤ گے اور عنداللہ وہ تمھارے لیے حرام ہی رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انما انا بشر وانتم تختصمون الیّ ولعلّ بعضکم یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشیءٍ من حق اخیہ فانما اقضی لہ قطعۃ من النار۔ یعنی میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں، ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور ایک اپنی حجت سے میرے سامنے اپنا حق ثابت کردو اور میں جیسی روداد سنوں اُس کے مطابق تمھارے حق میں فیصلہ کردوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اپنے کسی بھائی کے حق میں سے اگر کوئی چیز تم نے اس طرح میرے فیصلہ کے ذریعہ سے حاصل کی تو در اصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔